# بابُ التقریظ والانتقاد

## سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری

از سید محمد الحسنی، صفحات ۴۲۴، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، قیمت ۶ روپے

جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

تحریک ندوۃ العلماء کے ایک اہم رکن اور اسکے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی مونگیری کی مفصل سوانحعمری ہے، جسے دار العلوم ندوۃ العلماء نے شائع کیا ہے، اس میں مولانا کی ابتدائی زندگی سے لیکر وفات تک کے حالات بڑے شستہ اور شگفتہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں، ان کی پاکیزہ زندگی کے واقعات پڑھنے سے آج بھی اللہ کی محبت، اتباع سنت کا جذبہ اور درد مندی اور دلسوزی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، مولانا محمد علی، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے اجل خلفاء اور ہمعصر علماء و صلحاء میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے، انکے ذریعہ ہزاروں آدمیوں کو توبہ و انابت کی سعادت نصیب ہوئی، زہد و اتقاء کے ساتھ وہ ایک وسیع النظر داعی مفکر اور کامیاب مصنف بھی تھے، انھوں نے چھوٹی بڑی پچاس کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، خاص طور پر رد عیسائیت اور قادیانیت پر انکی کتابیں بہت ہی مقبول ہوئیں، ان ہی خصوصیات کی بنا پر تحریک ندوۃ العلماء کے محرکوں نے جن میں مولانا خود بھی شامل تھے، ان کو اسکا پہلا ناظم مقرر کیا، جس پر وہ عرصہ تک رہے، کئی برس بعد بعض داخلی اور خارجی حالات کی وجہ سے وہ اس سے مستعفی ہوگئے، اسلیے ضرورت تھی کہ مولانا کی ایک مفصل اور پُرمعلومات سوانحعمری شائع کیجاتی، اس کتاب سے یہ ضرورت بدرجۂ اتم پوری ہوگئی، کتاب میں کل سات ابواب ہیں، جن میں مولانا کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، مگر کئی وجوہ سے کتاب کا سب سے زیادہ قابل توجہ اور جاذب نظر تیسرا اور چوتھا باب ہے، خصوصیت کے ساتھ اہل ندوہ کے لیے۔

مولانا کی زندگی اور اسکے مختلف گوشوں کے بارے میں بعض جزئیات کو چھوڑکر دورائیں مشکل سے ہوسکتی ہیں، مگر ان دونوں ابواب میں جن مسائل کو چھیڑا گیا ہے، ان سے نہ صرف کتاب کے بارے میں بلکہ ان سے متعلق جو افراد بھی

زیر بحث آگئے ہیں، حتی کہ خود مولانا کی ذات کے بارے میں بھی دو رائے کا ہوجانا یقینی ہے، ان ابواب میں جن رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اس سے ندوہ کی وسیع النظری اور واقعیت ہی نہیں بلکہ خود مولانا کی سیرت کی افادیت بھی قدرے مجروح ہوجاتی ہے، ان ابواب میں واقعات کو ایک خاص انداز سے ترتیب دیکر تحریک ندوۃ العلما اور تاریخ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سلسلے میں بعض ایسے نئے پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کیگئی ہے جو نہ حیات شبلی کے مصنف کے علم میں تھے اور نہ ندوہ کے سالانہ جلسوں کی رودادوں ہی میں ان کا ذکر ملتا ہے، ان ابواب کا مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ مخصوص مزعومات و احساسات کو واقعات کا جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے ظاہر ہے کہ یہ تاریخ نویسی نہیں بلکہ تاریخ سازی ہے، اس بدعت کی ابتدا انگریزوں نے کی تھی، جسے سیاسی تاریخ نویسوں نے اپنالیا، اور اب مذہبی حلقے بھی ان ہی نقش قدم پر چل رہے ہیں، تاریخ سازی کی سب سے بڑی خصوصیت مبالغہ آمیزی (خواہ مدح میں یا قدح میں) اور جذباتیت ہوتی ہے جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس سے حقیقت اور واقعیت مسخ ہوجاتی ہے، خوب، ناخوب، اور ناخوب خوب بنجاتا ہے، ادھر ندوہ سے جتنا لٹریچر نکل رہا ہے اس میں اس طرح کے عناصر کی کارفرمائی بہت نظر آتی ہے، اور اسی کا ایک مظہر اس کتاب کے دو ابواب بھی ہیں۔

تحریک ندوۃ العلماء کے کارفرماؤں نے اردو کے افسانوی صحافتی اور جذباتی لٹریچر میں الندوہ اور دوسرے ذرائع سے جو انقلاب برپا کیا تھا، اس سے علم و ادب اور فکر و نظر کے تمام گوشے متاثر ہوئے تھے، الندوہ کی روش کو چھوڑنا تحریک ندوہ کی علمی حیثیت اور تاریخیت کی طرف سے ایک بدگمانی کی فضا پیدا کرنے کے مرادف ہے، یوں تو ان ابواب میں بہت سی باتیں قابل بحث ہیں لیکن خصوصیت سے دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ان ابواب کے مطالعہ کے دوران میں سب سے پہلی بات جو کھٹکتی ہے وہ یہ کہ تحریک ندوۃ العلماء کو ایک مخصوص ذہن کی پیداوار قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے، حالانکہ یہ تحریک کسی ایک ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ ایک اجتماعی احساس زیاں تھا، جو انفرادی طور پر بہت سے دلوں میں پیدا ہوا، اور اس نے مدرسہ فیض عام کے جلسۂ دستاربندی میں ایک اجتماعی شکل اختیار کرلی، سید صاحب حیات شبلی میں مدرسہ فیض عام کے جلسہ میں شریک علماء کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"مشرق و مغرب کے یہی دونوں مطلع تھے جس سے ندوۃ العلماء کا آفتاب طلوع ہوا"۔ (ص ۳۰۲)

پھر آگے لکھتے ہیں:۔ "اس منتخب جلسہ میں یہ طے پایا کہ باہمی مشورہ سے علماء کی ایک مجلس قائم کیجائے"۔ (صفحہ ۳۰۳)

پہلی رُوداد میں مولانا محمد علی کے یہ الفاظ موجود ہیں۔

"جب بہت سے نامور علماء مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسہ دستار بندی میں رونق افروز ہوئے اس وقت "بعض دور اندیش" علماء نے تحریک کی کہ ایک انجمن علماء کی قائم کیجائے، اس تحریک کو تمام علمائے موجودین نے پسند فرمایا"۔ (صفحہ)

مولانا خود دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ کسی ایک یا دو چار مخصوص ذہن کی پیداوار نہیں ہے

"ندوۃ العلماء ایسی انجمن نہیں جو کسی ایک شخص کے خیال سے یا دو چار آدمیوں کے مشورہ سے بغیر سمجھے بوجھے قائم کر دی گئی ہو"۔ (صفحہ ۳۰۵)

"بعض دور اندیش" سے ظاہر ہے کہ مولانا نے اپنی ذات تو مراد نہیں لی ہوگی، بلکہ صورت یہ ہوئی کہ موجود علماء میں بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا چونکہ یہ سب کے دل کی آواز تھی اور بہت سے دلوں میں پہلے سے اس کے لیے اضطراب موجود تھا اسلیے اس پر اتفاق ہو گیا، اور وہ مجلس قائم ہوگئی، مولانا محمد علی اسکے صف اول کے مویدین میں تھے، اس کے بعد مولانا حیدرآباد چلے گئے، پھر دوسرے سال جلسہ دستار بندی کے موقع پر تشریف لائے۔ اور اسی کے ساتھ ندوہ کا اجلاس بھی کیا، مولانا نے رُوداد میں یہ بھی لکھا ہے کہ بہت دنوں تک واپس آنے کا ارادہ نہیں تھا، مگر مدرسہ فیض عام کے جلسہ کی وجہ سے آنا پڑا۔

اس حصہ کو مصنف کتاب بالکل نظر انداز کر گئے ہیں

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ یہ تحریک کسی ایک شخص کے جیسا کہ خود مولانا محمد علی نے تحریر فرمایا ہے، ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ بہت سے درد مند اور مضطرب دلوں کی آواز تھی جس نے ایک اجتماعی تحریک کی صورت اختیار کر لی،

مولانا اسکے پہلے ناظم ضرور مقرر ہوئے، مگر اس سلسلہ میں مولانا کا کوئی ایسا انقلابی اور انفرادی کارنامہ نظر نہیں آتا، جس کی وجہ سے ندوہ کا ان کو بانی قرار دیا جائے، اسلیے کہ کسی تحریک یا ادارہ کے بانی کا طرز عمل ایک داعی اور وہ سب کام کرنے والے کا نہیں ہوتا، بلکہ وہ اسکو اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے، وہ اسکی ساری دلچسپیوں کا مرکز ہوتا ہے، وہ اسی کی خاطر سوتا اور اسی کی خاطر جاگتا ہے، علم و تقویٰ کے تمام امتیازات کے باوجود یہ چیز ہمیں مولانا کی عملی زندگی میں نظر نہیں آتی، اور نہ کتاب میں کوئی واقعی دلیل فراہم کی گئی ہے، بلکہ مولانا کا بار بار استعفیٰ پر اصرار کرنا اس دعویٰ کے خلاف دلیل ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے خط کا جو جملہ نقل کیا گیا ہے اسکی تردید خود مولانا کے مذکورہ بالا بیان ہی سے ہوتی ہے، پھر یہ بات خود قابل بحث ہے کہ کسی تحریک یا ادارہ کا بانی قرار دینے کے لیے اسکے انفرادی کارناموں اور بنیادی لٹریچر کے بجائے دوستوں کے ذاتی خطوط سے دلیل فراہم کیجائے۔

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ دارالعلوم دیوبند کے بانی نہیں ہیں، مگر انھوں نے جب اسکا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا تو بس اسی کے ہو رہے، اس سلسلہ میں انھیں بہت کچھ سرد و گرم سہنا پڑا مگر اس سے کسی آن جدا نہیں ہوئے، اسیلئے انھیں بانی قرار دیا گیا، اور یہ بڑی حد تک صحیح بھی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ بزرگوں سے کسی ادارہ کی نسبت اس کے اعتماد کی بڑی سند ہے، مگر اس کو کسی مخصوص طبقہ کے اعتماد کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرنا نفسیاتی کمزوری ہے۔

دوسری بات جو ان ابواب میں پڑھنے والے کو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ کتاب میں قصداً علامہ شبلی کی خدمات کو نظر انداز کرنے اور انکی ذات کو دینی اعتبار سے مجروح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، زہد و اتقا کے اعتبار سے دونوں میں تفاوت ضرور تھا مگر وفور محبت نبوی میں ز چشم آستیں بردار و گوہر تماشا کن اور خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہوا تھا کہنے والا بھی خدا کے یہاں کچھ کم مرتبہ نہ ہوگا۔ جہاں مولانا محمد علی اور علامہ شبلی کی طبیعتوں میں موازنہ کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں انکے خاندانی اثرات کا ذکر کرکے انکی سیمابیت اور انتہا پسندی کا جو بھیانک نقشہ پیش کیا گیا، اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ نہ صرف غلط ہے بلکہ شائستگیٔ قلم کے بھی منافی ہے، غیرت و حمیت کے نتیجہ میں ان کے دادا کا قبول اسلام اگر ایسا عیب ہے کہ کئی پشت تک اسکا اثر نہیں گیا، تو پھر بعض صحابہ جن میں حضرت حمزہؓ بھی تھے، کے اسلام کے بارے میں کیا رائے قائم کیجائے گی۔

ندوہ کا پہلا اجلاس مدرسہ فیض عام کانپور میں ہوا، جسمیں علامہ شبلی نے ایک تماشائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک فعال اور سرگرم عنصر کی حیثیت سے حصہ لیا، انھوں نے مدرسہ کے اجلاس کی صدارت کی تحریک کی، پھر ندوہ کے جلسہ کی تحریک صدارت کی بلکہ روداد کے الفاظ تو یہ ہیں کہ "کارروائی کا کاغذ پڑھکر سنایا"۔ آخر میں ندوۃ العلماء کیلئے دستور کا مسودہ پیش کیا، روداد میں ہے:

"اسکے بعد شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی نے جناب صدر سے اجازت لیکر دستور العمل پیش کیا اور مولوی فتح محمد صاحب نے تائید کی"۔

اس اجلاس میں نصاب تعلیم کی کمیٹی بنی، جس میں ان کا نام موجود ہے، دستور کے مطابق انہی نے مجلس انتظامیہ کی تشکیل کی

تجویز رکھی، غرض اس اجلاس کے سارے اہم کاموں میں انھوں نے نہ صرف حصہ لیا بلکہ متعدد کام انہی کی وجہ سے انجام پائے، اس اجلاس کی جو رُوداد اس کتاب میں بیان کیگئی ہے، وہ "حیات شبلی" اور ندوہ کی رُوداد سے جو خود مولانا محمد علی مونگیریؒ کی مرتب کردہ ہے مختلف ہے، علامہ شبلی کا صرف اتنا ذکر ہے کہ وہ اس جلسہ میں شریک تھے اُنکی کارروائیوں میں دلچسپی سے حصہ لیتے رہے (ص ۱۲۰) دستور کے سلسلہ میں حیات شبلی اور رُوداد کے بیان کے خلاف لکھا گیا ہے کہ دستور پیش کرنے کا کام مولانا محمد علی نے مولوی عبدالحق حقانی کے سپرد کیا تھا، لیکن وہ وقت مقررہ پر تشریف نہ لاسکے، چنانچہ مولانا شبلی نے صدر جلسہ کی اجازت سے پیش کیا (ص ۱۲۸) معلوم نہیں کہ ان معلومات کا ذریعہ کیا ہے، پھر مولانا حقانی کا نہ آنا اور علامہ شبلی کا بروقت دستور پیش کردینا بالکل سمجھ میں نہیں آتا، اگر مولانا حقانی نے اپنا مسودہ پہلے سے بھیج دیا تھا تو اس کا ذکر روداد میں کیوں موجود نہیں ہے،

مولانا شبلی کو نظرانداز کرنے اور ان کو مجروح کرنے کا جو منصوبہ نوجوان مصنف نے بنایا تھا اسکی تکمیل کی یہی صورت تھی، کہ ندوہ کے سلسلہ میں ان کی تصویر کا صحیح رخ سامنے نہ آنے پائے۔

ندوہ کی پہلے سال کی رُوداد اور حیات شبلی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن مقاصد کی تکمیل اور جن علمی، تعلیمی اور معاشرتی تبدیلیوں کیلئے تحریک ندوۃ العلماء کا وجود عمل میں آیا تھا ان میں سے کسی ایک کی تکمیل بھی مولانا محمد علی کے عہد نظامت اور مولانا عبدالحی صاحب کی نیابت یعنی ۱۸۹۶ء سے لیکر ۱۹۰۴ء تک نہیں ہوسکی، ان حضرات کے دلوں میں یہ خواہش ضرور تھی جیسا کہ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے، مگر ان سب کی تکمیل اور ندوہ کو اسکے علمی و تعلیمی معیار مطلوب سے قریب تر کرنے میں جس نے سب سے زیادہ حصہ لیا وہ علامہ شبلی کی ذات ہے، بلکہ آٹھ برس تک تو صورت حال یہ تھی کہ ندوہ کا دفتر تک گردش میں رہا، وہ کبھی لکھنؤ میں تھا اور کبھی شاہجہانپور میں، اور کبھی کسی اور جگہ اسکے لیے امن تلاش کرنیکی کوشش کیگئی، مولانا محمد علی کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ

> ندوۃ العلماء کے ماتحت بڑے پیمانہ پر ایک دارالعلوم کے قیام کی تجویز سب سے پہلے مولانا کے ذہن میں آئی اور مولانا نے اسکا ایک واضح خاکہ تیار کرکے ۱۲ محرم ۱۳۱۳ھ کے جلسۂ انتظامیہ میں پیش کیا اور اسکے بعد یہ خاکہ مسودہ دارالعلوم کے نام سے شائع کرکے استصواب رائے کیلئے ممتاز علماء، اکابرین اور اہل علم حضرات کو ارسال کیا گیا" (ص ۱۴۷)

اس بیان کے مقابلہ میں آپ حیات شبلی کے مصنف کا بیان جو اس تاریخ کے براہ راست چشم دید راوی ہیں ملاحظہ کیجئے،

اس سے پہلے ندوہ کے دستور کا ذکر آچکا ہے کہ اسے مولانا شبلی نے پیش کیا، اب نصاب تعلیم کی تبدیلی، دارالعلوم کی تجویز اور دوسرے امور کے

بارے میں سید صاحب کا بیان ملاحظہ ہو۔

"اسکے بعد بارہ علماء کی ایک مجلس ترتیب نصاب کے لیے مقرر ہوگئی جس میں ایک نام مولانا کا بھی تھا، ان بزرگوں نے رسالے لکھے، اور مولانا نے دار العلوم کے نصاب کے بجائے دار العلوم کا مسودہ (خاکہ) تیار کیا جس کو پڑھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا مسافر قسطنطنیہ کے کسی بڑے شہر میں کھڑا ہے۔" (حیات شبلی ص ۳۱۰)

سید صاحب آخری جملہ میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دار العلوم کے وسیع تصور کے مطابق اگر اسکا نصاب کوئی تجویز کر سکتا تھا تو وہ مولانا شبلی کی ذات ہے جو عرب، ترکی کی یونیورسٹیوں کا جائزہ لے چکے تھے، اور جنھوں نے حیدرآباد اور دوسرے کئی اداروں کا دینی نصاب تیار کیا تھا۔

مصنف کتاب نے لکھا ہے کہ ۱۲ محرم ۱۳۱۳ھ کو سب سے پہلے مولانا محمد علی نے دار العلوم کی تجویز مجلس انتظامیہ میں رکھی، اور سید صاحب کا بیان ہے کہ اس سے دو سال پہلے مولانا شبلی نے دار العلوم کا خاکہ مرتب کر دیا تھا۔

مجوزہ نصاب کے مطابق ایک الگ دار العلوم کی تجویز کے بارے میں مصنف کتاب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ مولانا محمد علی کا پیش کردہ ہے، مگر روداد اور حیات شبلی کے بیان سے اسکی تردید ہوتی ہے، اس سلسلہ میں سید صاحب کا پورا بیان ملاحظہ ہو:۔

"۱۰ رجب ۱۳۱۳ھ مطابق دسمبر ۱۸۹۵ء کو کانپور میں نصاب کا جلسہ ہوا.... اور مولانا شبلی نے شرکت کی اور کئی روز کے مباحثہ کے بعد مجوزہ دار العلوم کے نصاب کا خاکہ مرتب ہوا" (حیات شبلی ص ۳۶۱)

روداد میں مولانا محمد علی اپنے بارے میں لکھتے ہیں: "مجھکو بھی اس میں حاضر ہونے کی عزت حاصل تھی۔" ص ۴۴)

یہی مسودہ ہے جس کو علماء کی مخصوص کمیٹی نے طے کیا تھا جو اجلاس بریلی سے پہلے دوسرے علماء کے یہاں بھیجدیا گیا تھا اور اس کو پھر اجلاس خاص نے تجویز کی شکل دی، پھر وہ تجویز اجلاس عام میں پیش ہوئی، اس اجلاس کی تفصیل کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا (شبلی) نے اسکے پہلے ہی اجلاس میں حاضرین کے اصرار سے ندوۃ العلماء کے مقاصد پر ایک تقریر فرمائی، اسی اجلاس کے جلسۂ خاص میں دار العلوم کی تجویز منظور ہوئی۔"

"دوسرے دن، ۲۰ شوال ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۹۰۵ء کو ندوہ کے اجلاس عام میں مولانا عبدالحق حقانی نے دارالعلوم کی تجویز پیش کی (وہی تجویز جو جلسۂ خاص میں منظور ہو چکی تھی جس کا خاکہ علامہ شبلی نے دو سال پہلے بنایا تھا) اور مولانا شبلی مرحوم نے اسکی تائید کی اور اس سلسلہ میں دارالعلوم کی ضرورت پر ایک تقریر فرمائی جس میں نئے تعلیم یافتہ اور پرانے علما دونوں کو مخاطب فرما کر اس مجوزہ عربی مدرسہ کی ضرورت بدلائل ثابت کی، یہ بھی طے ہوا کہ مجلس دارالعلوم کے نام سے ایک الگ مجلس قائم کیجائے، اس مجلس کے قواعد مولانا شبلی مرحوم نے تیار کیے اور وہ ارکان کے پاس بھیجے گئے۔"

(حیات شبلی ص ۳۲۲)

ندوہ کے بنیادی مقاصد دو تھے، ایک موجودہ نصاب تعلیم کی تبدیلی، دوسرے نزاع باہمی کا خاتمہ، پہلے مقصد کی تکمیل کا سب سے بڑا ذریعہ ایک درسگاہ کا قیام تھا، اور دوسرے مقصد کی تکمیل کے لیے جدید و قدیم دونوں طبقوں میں اعتماد کی ضرورت تھی، نئی درسگاہ کے قیام کا مقصد محض ایک نئی عربی درسگاہ کا اضافہ نہیں تھا، بلکہ اس میں نئے نصاب تعلیم کے مطابق تعلیم تھی، درسگاہ تو ۱۸۹۸ء میں قائم ہوگئی، مگر اس کے قیام کے آٹھ برس یعنی ۱۹۰۴ء تک اس میں وہی نصاب تعلیم پڑھایا جا رہا جو عام درسگاہوں میں پڑھایا جاتا تھا، نصاب میں جدید علوم کے ساتھ انگریزی کا داخلہ بھی پیش نظر تھا، جیسا کہ مولانا محمد علی کے سیرت نگار نے لکھا ہے، مولانا بھی اسکے حامی اور موید تھے، مگر تعجب یہ ہے کہ مولانا اور انکے رفقا کار اپنے عہد نظامت و نیابت یعنی ۱۰ برس کی مدت میں کسی ایک جز میں نہ کوئی تغیر فرما سکے اور نہ کوئی تجویز عملی صورت اختیار کر سکی، مولانا شبلی نے انگریزی کی تجویز کو کئی بار مجلس انتظامیہ اور مجلس عام میں رکھا، وہ منظور ہوئی، مگر اس پر عمل نہ ہو سکا، مولانا شبلی اس کو نافذ کرنا چاہتے تھے لیکن انکو کوئی قانونی پوزیشن حاصل نہیں تھی، اسلیے وہ بار بار ارکان ندوہ کو اسکی طرف توجہ دلاتے تھے، مگر اس وقت جو لوگ دارالعلوم ندوہ میں دخیل تھے وہ اس کیلئے آمادہ نہیں تھے، بلکہ یہ حضرات تو دارالعلوم کی ایک الگ مجلس بھی بنانے کے لیے تیار نہیں تھے اسی وجہ سے مولانا شبلی کی شرکت انکو اور زیادہ گراں تھی، غرض یہ کہ مولانا شبلی کی آمد سے پہلے تک ندوہ کے قائم کردہ دارالعلوم اور دوسرے عربی مدارس میں کوئی خاص فرق نہیں تھا، علامہ شبلی نے اس کے بارے میں سیکڑوں خطوط دوستوں، بزرگوں اور اپنے خوردوں کو لکھے جو آج بھی مکاتیب شبلی میں موجود ہیں، ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:۔

"آج ایک نقشۂ نصاب جاریہ دارالعلوم ندوہ آیا، اس میں یہ کتابیں ہیں: ملا جلال، شرح جامی، فصول اکبری، میبذی، شافیہ، مکرمی! ہم آپ خدا کو کیا جواب دیں گے، کیا ندوہ کا یہی دعویٰ تھا......"

پھر انہوں نے مولانا شروانی کو دوسرا خط لکھا کہ (یعنی مولانا شبلی نے) اسی کے متعلق مدرس لول کو لکھا تھا، انکا جواب آیا ہے:

"جدید نصاب ہم لوگوں کو دکھایا تک نہیں گیا۔" (ص ۳۹۳)

جب عربی کتابوں میں تبدیلی کا یہ حال تھا تو انگریزی کے اجراء میں انکو کیا کیا دقتیں نہ اٹھانی پڑی ہونگی، اس کا کچھ انداز ان کے خطوط سے ہوتا ہے، دسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں،

"جلسہ انتظامیہ میں باقاعدہ انگریزی داخل کرنے کی تحریک میں نے کی تھی، اور اصرار کیا تھا کہ تحریک درج تحریر کیجائے.... لیکن اسکی کیا وجہ ہے کہ کارروائی میں میری تحریک لکھی بھی نہ جائے۔"

اس کے جواب میں مولانا شروانی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، تو لکھتے ہیں:

"بات تو کچھ نہیں لیکن مولوی عبدالحئی کی بھاز جوئی اور آپکے خارق العادۃ بھولنے پر تعجب آتا ہے جب میں نے دیکھا کہ انگریزی کے مسئلہ پر گفتگو نہیں ہوتی تو میں نے کسی قدر سختی سے کہا کہ اس سے کیوں گریز کیا جاتا ہے، آپنے فرمایا کوئی شخص محرک نہیں، میں نے کہا، میں ہوں، اور میرا نام لکھا جائے، مولوی یونس خاں نے کہا میں تائید کرتا ہوں۔"

ان کوششوں کے باوجود دو سال تک پھر یہ معاملہ ملتوی رہا، مولانا شبلی نے بار بار اسکی طرف توجہ دلائی، ایک خط میں مولانا شروانی کو دوستانہ انداز میں لکھتے ہیں:- "ایک ہمارے روشن خیال مولانا شروانی ہیں...... انکا حال یہ ہے کہ انگریزی کے نام سے انکو لرزہ آتا ہے۔ بڑی مشکل سے سلمانوں کو پھسلانے کی تجویز پر راضی ہوئے، تو عمل درآمد میں حیران ہیں۔" (ص ۴۱۷)

غرض یہ کہ عربی نصاب کی طرح جدید علوم اور انگریزی کا اجراء بھی باقاعدہ اس وقت ہوا جب مولانا شبلی ۱۹۰۵ء میں دارالعلوم کے معتمد تعلیم ہو گئے، انہوں نے شدید موانع اور رکاوٹوں کے باوجود اس نصاب کو جاری کیا جس کیلئے دارالعلوم قائم کیا گیا تھا۔

اس تفصیل کا مقصود یہ ہے کہ ندوہ اور دارالعلوم کے اجراء کے مقاصد کی تکمیل میں نہ صرف یہ کہ مولانا شبلی کا حصہ دوسرے حضرات سے کم نہیں تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ندوہ نے جو نمونے بھی پیش کیے اگر ان میں انکی روح کارفرما ہوتی تو اسکو اور اسکے فضلاء کو عام عربی مدارس پر کوئی تفوق نہ ہوتا، خصوصیت سے دارالعلوم کے معاملات میں تو دوسرے حضرات کا طرز عمل نہ تو ندوہ کے مقاصد سے میل کھاتا اور نہ اس میں کوئی ایسی بلندی نظر آتی کہ علامہ شبلی کو ندوہ کی تاریخ میں کوئی درجہ نہ دیا جائے، اور دوسرے حضرات سارے امتیازات کے مستحق گردانے جائیں،

مقدمہ دیکھے علاوہ اس کے بعض اور ضمنیات اور بعض دوسرے ایسے واقعات ہیں جو قابل بحث ہیں، مگر مقصود انکا احاطہ نہیں ہے بلکہ تاریخ سازوں کی ذہنیت کی نشاندہی ہے۔